Al-Hikmat
Volume 34 (2014) p.p. 1-26

وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدتِ شاہدین (۳)

ڈاکٹر عبدالحفیظ فاضلی

پروفیسر/چیئرمین ریٹائرڈ، شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، لاہور۔ پاکستان

خلاصہ

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی صدیوں سے ہی روحانیت (Islamic Spirituality) کو اسلام کی روح کے عین مطابق سمجھتی چلی آرہی ہے؛ اسی طرح ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھا ہے۔ اسلام میں روحانیت سے انکار کیا جائے یا اسے عین اسلام قرار دیا جائے، بات سند کے ساتھ ہو تو اس سے نور پھیلے گا، اگر اس کے بغیر ہو تو کنفیوژن پیدا ہوگا۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا سند کے ساتھ بات کرنا ہے کہ اللہ نے اپنے نازل کردہ کلام کو 'الحق' فرمایا ہے اور حال پر یہ درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ قرآن پاک اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ماضی میں اللہ کے نازل کردہ کلام میں تحریف ہو چکی ہے۔ لہٰذا اسے سند کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام میں روحانیت کی مختلف شکلوں کیلئے تصوف کا لفظ رائج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ قرآنِ پاک میں کہیں آیا ہے اور نہ ہی کسی آیت سے اخذ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے 'احسان' کو ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ قرار دیکر اسلام میں روحانیت کا ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے علم کے مطابق یہ لفظ قرآنِ پاک میں کہیں بھی ماننے کے کسی درجے (level of believing) کیلئے نہیں آیا۔ اسی طرح اگر 'احسان' کو 'حسنِ عمل' کے مترادف قرار دے کر تصوف کو حسنِ عمل سکھانے کی طریقت کے معنوں میں 'احسان اسلام' قرار دیا جائے تو بات تب بھی نہیں بنتی۔ حضرت فضل شاہ اپنے وقت کے بہت بڑے روحانی بزرگ تھے۔ حضرت فضل شاہ اور آپ کے خلیفہ محترم محمد اشرف فاضلی، تفسیر فاضلی کے مصنف ہیں۔ تفسیر فاضلی قرآن پاک کے لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا ماخذ قرار دیتی ہے۔ جسے عرف عام میں تصوف کہا جاتا ہے، تفسیر فاضلی کے مطابق اسے قرآن پاک کے حوالے سے بجا طور پر طریقت شاہدین کے نام سے موسوم کیا جانا چاہئے۔ طریقت شاہدین' عطائے تزکیہ اور تصدیق کی طریقت کا نام ہے۔ اہل روحانیت پر بدعت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ 'بدعت' (principle of innovation) قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو بنیاد فراہم کرتا ہے اور قرآن پاک کی مقرر کردہ حدود کے اندر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے جلا، انسانی فکر و تجربہ کے

حاصلات کوعلم الٰہی کے ساتھ relate کرنے ، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصولوں کی نئی تعبیر اور نئے اداروں کو وجود میں لانے کیلئے ازبس لازم ہے۔مروجہ تصوف صدیوں سے 'وحدت الوجودی' اور 'وحدت الشہودی' مکاتب فکر میں تقسیم ہے۔دونوں مکاتب فکر اپنا نظریہ قرآن پاک کی سند سے پیش کرنے کے بجائے اپنے اپنے کشف ومشاہدہ کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔کسی بھی نظریہ کے درست ہونے کیلئے اسکی قرآن پاک سے مطابقت لازم ہے۔تفسیر فاضلی، وحدت الوجود کو قرآن پاک کے حوالے سے درست نظریہ نہیں مانتی۔تاہم اس مکتب فکر میں بھی بعض بزرگ عشق رسول کے حوالے سے بہت اعلیٰ مقامات پر پائے گئے ہیں اس لئے یہی کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عشق رسول کو قبول فرماتے ہوئے ان سے درگزر فرما لے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔تفسیر فاضلی دین میں کسی نئے مکتب فکر کی بنیاد نہیں رکھنا چاہتی ،تاہم لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا ماخذ قرار دینے اور اپنے کشف وشہود کے بجائے قرآن پاک کی سند سے بات کرنے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیر فاضلی کے نقطہ نظر کو 'وحدت شاہدین' کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔درج ذیل مضمون میں اسلام میں روحانیت کے ماخذ اور حقیقت پر تفسیر فاضلی کا نقطہ نظر قرآن پاک کی سند کے ساتھ تشکیل دیا گیا ہے۔

قرآنِ پاک میں اولی الالباب (عقلمند لوگوں) کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ چلتے پھرتے ،اٹھے ہوئے بیٹھے ہوئے ،اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ذاکر کو اولی الباب کی معیت حاصل ہو جاتی ہے، وہ اولی الالباب میں شمار ہو جاتا ہے۔فرمایا گیا ہے کہ بے شک اللہ کے ذکر ہی میں اطمینانِ قلب ہے۔(۲۸:۱۳) ذاکر کو اطمینانِ قلب عطا ہو جاتا ہے،اور اطمینانِ قلب کیلئے تو انبیاء کرام نے بھی دعا کی ہے۔(۲۶۰:۲) قرآنِ پاک میں منصبِ شاہدین میں تزکیہ عطا فرمانے (purification) کا تو ذکر ہے، لیکن تہذیبِ نفس کی اصطلاح ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔کیا تزکیۂ نفس عطا ہونے کے باوجود تہذیبِ نفس ہونا باقی رہ جاتا ہے!اس کی سند کیا ہے؟قرآنِ پاک میں ایک مقام پر حضورﷺ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ آپ آیات تلاوت فرماتے ہیں،تزکیہ عطا کرتے ہیں، اور کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔(۱۶۴:۳) دوسرے مقام پر عطائے تزکیہ کا ذکر کتاب وحکمت کا علم عطا فرمانے کے بعد ہے۔(۱۲۹:۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔جسے تزکیہ عطا فرمانے کا شرف ہے وہی بہتر جانتا ہے کس کے لئے کون سی صورت موزوں ہے۔'ذکر' کے ضمن میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر ایک کیلئے ہر ذکر مفید نہیں

ہوتا۔حضرت فضل شاہ اور حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب کا ارشاد ہے: ذکر ایک دعویٰ ہے۔جس دعوے کے ساتھ شہادت موجود نہ ہو وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔ایک صاحب حضرت فضل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: بزرگوں کا ماننے والا ہوں۔'اداریہ قادریہ نور والوں کا ڈیرہ' کا بورڈ دیکھ کر سلام کے لئے حاضر ہو گیا ہوں۔حضرت صاحب نے اس کی عزت افزائی کیلئے اہتمام فرمایا، اپنے ارشادات کے ذریعے روحانی خوراک مہیا کی، جب وہ رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا: ذکر کیا کرو یَا وَدُودُ، یَا وَدُودُ پڑھا کرو۔اس نے برا منایا اور کہا میں جو ذکر پہلے کرتا ہوں وہی ٹھیک ہے۔حضرت صاحب نے فرمایا: جو بتایا ہے اس پر عمل کرو، کہیں مشقت میں نہ پڑ جانا۔کچھ عرصے کے بعد اس کا خط آیا۔جیل میں تھا۔عرض کیا: آپ صاحبِ نظر ہیں۔مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ نے تو میرا ہی بھلا چاہا تھا۔میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔میرے لئے دعا فرمائیں، اور مجھے بتائیں میں کیا کروں تا کہ مشقت سے نجات ہو۔حضور پیر صاحب نے جواب لکھوایا: چلتے پھرتے، اٹھے ہوئے بیٹھے ہوئے، اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے یَا وَدُودُ، یَا وَدُودُ پڑھتے رہو۔تمھیں اٹھا کر جیل سے باہر پھینک دیں گے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ڈیرہ پاک پر سلام کیلئے حاضر ہوا۔عرض کیا: دل و جان سے حضور کے ارشاد پر عمل شروع کر دیا۔کچھ ہی دنوں بعد جیل حکام کو احساس ہوا کہ قانونی تقاضے پورے نہیں ہیں اور مجھے انھوں نے جیل میں رکھا ہوا ہے، اگر یہ بات عدالت کے علم میں آ گئی تو خود ان کیلئے مشکل پیدا ہو جائے گا۔انھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ مجھے فوراً جیل سے فارغ کر دیا جائے۔اس کے رخصت ہونے کے بعد محبین میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: حضور! ذکر تو یہ پہلے بھی کر رہا تھا اور اللہ ہی کے پاک ناموں کا کر رہا تھا، آپ نے بھی اللہ ہی کے ایک پاک نام کا ذکر تلقین کیا، تو پھر حضور نے یہ کیوں فرمایا کہ یَا وَدُودُ، یَا وَدُودُ پڑھا کرو، کہیں مشقت میں نہ پڑ جانا۔پیر صاحب نے فرمایا: یہ سرکاری ملازم ہے۔معاملے میں دیانت دار نہیں تھا۔' یَا لَطِیفُ یَا خَبِیرُ' کا ذکر ہر وقت کرتا تھا۔دعویٰ یہ تھا ''یا اللہ تو ہر بات کی خبر رکھنے والا، نہایت باریک بین ہے۔'' عمل اس کے بالکل برعکس تھا، ہر وقت جھوٹا ثابت ہو رہا تھا، مشقت تو آنی ہی تھی۔عرض کیا: حضور! اگر وہ یَا وَدُودُ، یَا وَدُودُ کا ذکر کرتا لیکن عمل اسکا وہی رہتا تو پھر اس پر مشقت نہ آتی! فرمایا: 'الوَدُود کا مطلب ہے 'محبت کرنے والا دوست'۔جو اللہ کو اس نام سے پکارتا ہے وہ اس سے محبت اور دوستی ہی کا سوال کرتا ہے۔اگر اسکا عمل ابھی ٹھیک نہیں تو بھی اللہ اسے مشقت سے بچا لیتا ہے۔اگر یہ ذکر کسی پاک بندے نے بتایا ہے اور کرنے والا یکسوئی سے کرتا رہے تو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اسے برائی کے دائرے سے باہر نکل جانے کا شرف ہو جاتا ہے۔خود میرے سامنے کا واقعہ ہے: ایک خاتون حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔عرض کیا: ''لو میرج کی

ہے۔والدین کی اجازت سے کی ہے۔میاں بہت اچھا ہے۔آمدنی بھی مناسب ہے۔چند سسرالی رشتہ دار میرے ساتھ رہتے ہیں۔طبیعت میں بے چینی اتنی زیادہ ہے کہ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلی جاؤں۔ایک دن ایسا ہوا بھی۔میں نے بیگ تیار کیا، پکا ارادہ کرلیا آج میں نے چلے ہی جانا ہے۔گھر سے باہر نکلی۔خیال آیا جانے سے پہلے اپنے میاں سے مل لوں۔اس کے دفتر چلی گئی۔اللہ کا شکر ہے کہ اس سے ملاقات ہوگئی۔اس نے مجھے سنبھالا دیا اور گھر واپس لے آیا۔میں سوچتی ہیں اگر میں ایک رات بھی گھر سے باہر رہ جاتی تو میرا کیا بنتا۔لیکن حضور طبیعت میں اضطراب بہت ہے۔' پیر صاحب نے فرمایا:'تم اللہ کے فلاں فلاں ناموں کا ذکر کرتی ہو!'وہ چونک سی گئی۔'حضور! وہ تو میں کرتی ہوں۔'فرمایا: اللہ کے جن ناموں کا تم ذکر کرتی ہو ان کا ذکر کرنے والا سیماب صفت ہو جاتا ہے۔اس ذکر سے راحت بھی ہوتی ہے، لیکن طبیعت میں اضطراب بہت بڑھ جاتا ہے۔مزاج میں ٹھہراؤ نہیں رہتا۔زندگی پر اسکے اثرات مرتب ہونا لازم ہیں۔فرمایا: فوراً یہ ذکر بند کردو اور جو ہم بتاتے ہیں وہ کیا کرو، طبیعت میں اعتدال آجائے گا۔فرمایا: کچھ اور بھی ذکر کرتی ہو۔عرض کیا: 'ربّ انّی مغلوبٌ فانتصر پڑھتی ہوں'۔فرمایا: یہ کس لئے پڑھتی ہو۔عرض کیا: اس لئے پڑھتی ہوں کہ میرے سسرالی رشتہ داروں پر میرا رعب رہے۔فرمایا: تمھیں پتہ ہے جب ساڑھے نوسو سال تک نہایت صبر سے تبلیغِ حق کرنے کے باوجود قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو ماننے سے یکسر انکار کر دیا اور آپ کو دھمکی دی اور جھڑکا تو آپ نے ان الفاظ میں اپنے رب کو مدد کیلئے پکارا تھا، اور تم کیا کر رہی ہو۔چار قسم کے لوگ والدین کے درجے میں ہوتے ہیں: جن کے ہاں پیدائش ہوتی ہے، جو رزق کمانے کا علم سکھاتا ہے، میاں/بیوی کے والدین، شاہد اور اسکے اہلِ خانہ۔اللہ کا حکم یہ ہے کہ والدین سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ، ان کے آگے رحمت کے بازو بچھاؤ، انھیں جھڑکو مت، ان کی خدمت کرو معروف طریقے سے۔اور تم ان کے حوالے سے وہ دعا کر رہی ہو جو حضرت نوح علیہ السلام نے قومِ کافرین کیلئے کی تھی۔یہ بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔''فرمایا: ذکر کرنے کا علم شاہدین سے سیکھنا چاہئے۔ذکر کا منشا خواہشات کی پیروی نہیں بلکہ اولی الباب کی معیّت ہونا چاہئے۔ہر ذکر ایک دعویٰ ہے۔اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ دعویٰ بلا شہادت قابلِ سماعت ہی نہیں ہوتا۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: بے شک اللہ اور اسکے ملائکہ نبی پاک ﷺ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی حضور پر صلوٰۃ بھیجا کرو اور سلام بھیجا کرو۔عام طور پر کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ درودِ پاک سے بڑا وظیفہ ہی کوئی نہیں۔ایک روایت سے یہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ درودِ پاک ایسا ذکر ہے جو ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بات درست نہیں۔درودِ پاک ہر وقت پڑھا جا سکنے والا وظیفہ نہیں۔مصنف کا اپنا تجربہ بیان

کرنے سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا: بی اے کی تعلیم کے دوران میں بیمار ہو گیا۔ چند سال تک با قاعدہ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع رہا۔ اسی دوران تصوف میری توجہ کا مرکز بنا۔ تصوف کے بارے میں سوچتا میں پہلے بھی رہتا تھا، لیکن عملاً اسے جاننے کوشش نہیں کی تھی۔ بیماری اور فراغت کے ان سالوں میں چند مشہور صوفیاء کے تذکرے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ کشف و کرامات کے واقعات سے زیادہ کچھ سمجھ نہ آئی۔ لیکن اندر ایک لگن لگ گئی کہ اس کی حقیقت کا پتہ چلے۔ اگر یہ کوئی بہت اعلیٰ درجے کا علم ہے تو پھر اس کے حصول میں لگ جایا جائے، اور اگر یہ کوئی بہت اعلیٰ درجے کا علم نہیں ہے تو بھی پتہ چلے۔ طبیعت میں سنجیدگی پہلے ہی تھی، بی اے کی تعلیم کے دوران ایک استادِ محترم نے میرے مزاج کو دیکھتے ہوئے میرے مضامین تبدیل کروا کے سائنس سے مجھے فلسفے کا طالبعلم بنوا دیا۔ بیماری سے سنجیدگی میں اور اضافہ ہوا۔ ہر وقت ایک ہی لگن تھی، زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کو پانے کا یقینی راستہ کیا ہے۔ تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ جس علم کا یہ دعویٰ کرتے ہیں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ آسانی اور عزّت کے ساتھ یہ علم حاصل کیسے ہو۔ انھوں نے اپنے لئے اتنے امتیازات اختیار کئے ہوئے ہیں، اتنے اونچے پیڈسٹل پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں کہ طالب علم اپنے آپ کو بے وقعت محسوس کرتا ہے۔ کوئی سوال پوچھنا عموماً بے ادبی سمجھا جاتا ہے، اگر جواب ملتا ہے تو عقل کو اپیل نہیں کرتا، کشف و کرامات، بے سند روایات، حقیقی یا فرضی بزرگوں کے حقیقی یا فرضی خواب یا مشاہدات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک کی سند سے بات کرنے کا یہاں رواج ہی نہیں۔ اختلافِ رائے کے اظہار کی اجازت نہیں۔ بیعت سے پہلے کچھ بتانے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں ایک بزرگ نے جن کی خدمت میں مجھے کثرت سے حاضری کا شرف تھا اور جن کی بے غرضی بہت قابلِ قدر تھی، مجھ سے حضرت فضل شاہ صاحب کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ بڑے صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ جسمانی علاج کا بھی بہت بڑا علم رکھتے ہیں۔ آپ ان سے ملیں۔ ۱۹۷۷ یا ۱۹۷۸ کی بات ہے۔ ڈیرہ پاک کے اندر داخل ہوا اور پیر صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، حاجی سلطان احمد نام کے ایک صاحب نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا جہاں بہت سادہ انداز میں بیٹھنے کا اہتمام تھا۔ ایک عمر رسیدہ بزرگ کسی دوسرے بزرگ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ پیر صاحب ہیں۔ فارغ ہونے کے بعد انھوں نے جب مجھ سے آنے کا مقصد پوچھا تو پتا چلا کہ یہی حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ ہیں۔ میں نے اپنی روحانی اور جسمانی کیفیت بیان کی۔ فرمایا: ذکر کیا کرو، یَا وَدُودُ، یَا وَدُودُ پڑھا کرو۔ غذا کے بارے میں رہنمائی دی اور فرمایا کہ اس پر عمل کرو، فائدہ ہو گا۔ میں نے یہ عرض کرنا بہت ضروری سمجھا کہ جناب میں تو پچھلے چھ ماہ سے ہر وقت باوضو رہ کر درودِ پاک پڑھتا رہتا ہوں۔ حضرت صاحب نے بہت ہی دوٹوک انداز میں فرمایا: ”جب

تک ذکرنہیں کرو گے، کچھ نہیں بنے گا۔'' میرے پاس اب مزید کہنے سننے کیلئے کچھ نہیں تھا۔اجازت لی ،کچھ فاصلے پر ایک چارپائی پڑی نظر آئی وہاں جا بیٹھا اور سوچنے لگا 'کتابوں میں تو لکھا ہوا ہے درودِ پاک سے بڑا وظیفہ ہی کوئی نہیں، یہ بزرگ کہتے ہیں جب تک ذکرنہیں کرو گے، کچھ نہیں بنے گا۔' حاجی سلطان احمد صاحب نے مجھے اس کیفیت میں دیکھا تو کہا کہ یہاں اس حجرہ پاک میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، پیر صاحب کے خاص عقیدتمند ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان سے مل لیں۔لیکن میں ڈاکٹر صاحب سے نہیں ملا اور کچھ دیر کے بعد ڈیرہ پاک سے چلا آیا اور دوبارہ نہیں گیا۔کتابیں لکھنے والوں کے علم کو بڑا سمجھا، پیر صاحب کی بات پر عمل نہیں کیا۔اس دوران میں نے شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ایک سنجیدہ طالبعلم کی حیثیت سے اپنے نہایت مشفق اور قابل اساتذہ کی رہنمائی میں ہزاروں سالوں پر محیط تاریخِ فلسفہ میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔لیکن احساس یہی تھا کہ اصطلاحات سیکھی ہیں،نظریات پڑھے ہیں، بحث وتمحیص کے فن کا پتہ چلا ہے؛ لیکن سوالوں کا ایسا جواب نہیں ملا جو دل و دماغ کو اطمینان عطا کر سکے۔چند سال شکرگڑھ کے سرکاری ڈگری کالج میں فلسفہ کا لیکچرر رہنے کے بعد ۱۹۸۴ میں گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ میں تبادلہ ہوگیا۔۱۹۸۵ میں شادی کے بعد ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔شکرگڑھ کے قیام کے دوران بھی تلاش کا عمل جاری رہا، کچھ بزرگوں کی خدمت میں حاضری بھی رہی، اندر جو تڑپ تھی وہ مزید بڑھ چکی تھی،طبیعت میں چین نہیں تھا۔سوالوں کے ایسے جواب جو میرے دل اور دماغ میں اتر جائیں کہیں سے ملتے نہیں تھے۔کسی سے ملاقات میں ایک ہی موضوع ہوتا تھا: حق کیا ہے۔حق کا علم کیسے ہو۔ایمان کیا ہے۔خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے خدا کے نام پر ایک دوسرے کا گلا کیوں کاٹتے پھرتے ہیں۔فرقہ بندی کی حقیقت کیا ہے۔ایک قرآن اور ایک رسول کو ماننے والے فرقوں میں کیوں بٹ گئے ہیں۔تصوف کی حقیقت کیا ہے۔کتابوں میں تو بہت سے واقعات ہیں کہ کوئی بندہ پیر صاحب کی خدمت میں گیا، پیر صاحب نے نظر کی اور بندہ بدل گیا لیکن حقیقت میں تو کوئی ملتا نہیں۔داتا صاحب ہیں یا دوسرے بزرگ جن کے مزارات پر تانتا بندھا رہتا ہے، کیا یہ صرف ماضی ہی میں تھے، حال پر نہیں ہوتے !اگر حال پر اس درجے کے لوگ نہں ہوتے تو ماضی میں ان کے ہونے کا کیا ثبوت ہے۔وحدت الوجود کیا ہے، وحدت الشہود کیا ہے۔صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے، حق کا معیار کیا ہے۔

فلسفی اپنے تصور کائنات کے مطابق اصطلاحات (terms) وضع کرتا ہے، ان اصطلاحات میں سوال تشکیل کرتا ہے۔یہ سوال کچھ ایسے پیش مفروضوں (presuppositions) پر مبنی ہوتے ہیں جنہیں وہ بدیہی

صداقت (self-evident truth) سمجھتا ہے اور انھیں ثابت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان کے جواب میں قیاسی نظریات (theories) پیش کرتا ہے، حق اور مخالف میں آنے والے حقیقی یا متوقع اعتراضات کا جائزہ لیتا ہے، دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے حقیقت کو دریافت کیا ہے، حقیقت ویسی ہی ہے۔ اگلا فلسفی اس کے پیش مفروضوں ہی کو رد کر دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اس کا سوال ہی بے معنی یا غلط ہے۔ اگر مقدمات کو مان لیتا ہے تو اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ کیا اس کا نظریہ خود اپنی تنقیص تو نہیں کرتا۔ کیا نتیجہ منطقی قوانین کے مطابق درست اخذ کیا گیا ہے۔ اور پھر اس بات کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ جس منطق کو معیار مانا گیا ہے کیا وہ خود بھی درست ہے۔ فلسفیانہ مسائل ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان کا جواب نہ تو کسی سائنسی لیبارٹری میں تلاش کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی ریاضیاتی طریقے سے۔ فلسفہ صرف عقل ہی کو حتمی ذریعہ علم مانتا ہے، اور اس کے نزدیک عقل سے مراد وہ صلاحیت ہے جس کی بنیاد پر استدلال کیا جاتا ہے۔ صحتِ استدلال کیلئے فلسفی ان اصولوں کو معیار بناتے ہیں جنہیں سب سے پہلے ارسطو نے منطقِ استخراجیہ اور منطقِ استقرائیہ کی صورت میں منضبط کیا۔ منطقِ استقرائیہ کا استعمال زیادہ تر سائنسی علوم میں ہوتا ہے۔ فلسفے میں استدلال منطقِ استخراجیہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

منطقِ استخراجیہ بھی کوئی حتمی معیار نہیں صحتِ استدلال کا۔ منطقیین نے ارسطو کے منضبط کیے ہوئے اصولوں پر بھی شدید تنقید کی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ منطق اپنی مابعد الطبیعات کے تابع ہوتی ہے۔ ارسطو کی وجودیات (ontology) دو انتہائی اصولوں یعنی خالص صورت اور خالص مادہ کو مطلق حقیقت قرار دیتی ہے، اور یہ ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی ہر شے ان دو اصولوں پر مشتمل ہے۔ اس وجودیات کی بنیاد پر جو منطق تشکیل پذیر ہوتی ہے وہ ثنوی (dualistic) ہے۔ شئے کو موضوع اور محمول میں تحویل کر کے اپنے فکری مقدمات تشکیل دیتی ہے۔ مادی اشیاء کی حد تک تو یہ منطق قابلِ استعمال ہے، لیکن جب ثنوی مابعد الطبیعات (dualistic metaphysics) پر مشتمل یہی منطق ذاتِ باری کیلئے بھی استعمال کی جاتی ہے تو یہ خدا تعالیٰ کو (ارسطو کی مابعد الطبیعات کی اصطلاحات) 'ذات' (essence) اور 'صفات' (attributes) میں تحویل کر کے متصور کرتی ہے۔ مسلم الٰہیات اور فلسفہ کے اکثر مسائل میری تحقیق کے مطابق ارسطو کی منطق، وجودیات، اور مابعد الطبیعات کے قرآنِ پاک کے نظامِ عقائد سے یکسر متناقض اصولوں کو، قبول کرنے سے پیدا ہوئے اور صدیوں سے ہم اس میں الجھے ہوئے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے مصنف کے مضامین بالخصوص قرآن: خلق یا امر، اور مسئلہ ذات وصفاتِ باری؛ علمِ مطلق اور انسانی آزادی، اور دیگر مضامین)۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ فلسفے میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوتی۔ پیش فرضیے حتمی ہوتے ہیں نہ اصطلاحات اور مقدمات، استدلال حتمی ہوتا ہے نہ

منطق، وجودیات حتمی ہوتی ہے نہ مابعدالطبیعات۔خود عقل کا تصور جس پر فلسفہ استوار ہوتا ہے وہ بھی حتمی نہیں ہوتا۔صرف نظریات (theories) ہوتے ہیں جنھیں فلسفی پڑھتے اور پڑھاتے رہتے ہیں۔حیرت ہوتی ہے ان مذہبی لوگوں پر جو فلسفے کو آئیڈیل بنا لیتے ہیں، قیاس آرائیوں کو علم سمجھتے ہیں اور مذہب کو فلسفہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فلسفہ کے مطالعہ سے بھی سوالات کے جواب نہیں ملے اور تشنگی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔۱۹۸۶ میں ایک عزیز سے ملاقات ہوئی۔یہی بات موضوعِ گفتگو تھی۔اس نے کہا یہاں بھاٹی گیٹ میں اونچی مسجد کے پاس، حنیف رامے صاحب کے بھانجے کے مکان میں، ایک بزرگ رہ کر گئے ہیں، انھیں ڈاکٹر صاحب کہا جاتا تھا۔عمر رسیدہ نہیں تھے۔انکی بات بہت متاثر کرتی تھی۔بڑے صاحبِ علم تھے اور تفسیر فاضلی کے نام سے تفسیر پاک لکھ رہے تھے۔اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور حنیف رامے کی طرح کے صاحبانِ علم ان کے پاس آیا کرتے تھے۔لنگر کا بہت اعلیٰ اھتمام ہوتا تھا۔کوئی سوال پوچھا جاتا تو جواب ایسا ہوتا کہ دل کے اندر اترتا چلا جائے۔کسی معاملے میں مشورہ کیا جاتا تو اس میں حکمت کا احساس ہوتا اور عمل کرنے سے واقعی بہت فائدہ پہنچتا۔علاج بالغذا کے طریقے سے علاج کرتے تھے۔لا علاج بیماروں کو محض ان کی ہدایت پر عمل کر کے صحتیاب ہوتے دیکھا۔کچھ عرصہ پہلے وہ یہاں سے کوٹ لکھپت تشریف لے گئے ہیں، مجھے ان کے رحمت خانے کا پتہ ہے، اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو میں آپ کو لے جاسکتا ہوں۔معلوم ہوا یہ وہی ڈاکٹر صاحب ہیں جن کا ذکر حضرت فضل شاہ قطبِ عالم رحمۃ اللہ علیہ کے 'ادارۂ قادریہ نوروالوں کا ڈیرہ' پر حاجی سلطان احمد نے کیا تھا۔میں نے کہا چلو ابھی چلتے ہیں۔پیکورو ڈکوٹ لکھپت پر مائیکرو الیکٹرونکس کے بالمقابل، ایک رہائشگاہ پر پہنچے جو فاضلی فاؤنڈیشن کے نام سے موسوم ہے۔ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس نہایت باوقار شخصیت۔سٹیل کی بنی چند کرسیاں پڑی تھیں، ساری ایک جیسی۔فرمایا: تشریف رکھیں۔حافظ صاحب (میرے عزیز) نے میرا تعارف کرایا۔فرمایا: جی پروفیسر صاحب! کیسے تشریف لائے۔عرض کیا کچھ سوالات ہیں، جواب نہیں ملتا۔سخت بے چینی ہے، حق کا پتہ نہیں چلتا۔اطمینانِ قلب کی تلاش ہے، راستہ نہیں ملتا۔فرمایا: سوال بیان کیجئے۔عرض کیا: ایمان سے کیا مراد ہے۔ارشاد فرمایا: حبّ الناصحین شرطِ ایمان ہے۔ناصحین سے محبت ہو تو ایمان ہوگا، ورنہ دعویٰ جو بھی ہو، ایمان نہیں ہوسکتا۔فرمایا: جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوگیا، تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! بے شک میں تمھیں ارشاداتِ ربّانی پہنچاتا رہا، تمھیں نصیحت کرتا رہا۔لیکن تمھیں حبّ النّاصحین ہی نہیں تھی۔(۷:۷۹) عرض کیا: ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے۔فرمایا: یہ متقین

کی پہلی صفت ہے، جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ 'قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ہے متقین کیلئے'
(۲:۲) عرض کیا: قرآنِ پاک کیوں کتابِ ہدایت ہے صرف متقین کیلئے! قرآن پاک کا نزول تو ہوا ہے سب زمانوں اور سب انسانوں کیلئے۔ فرمایا: ہر کام کیلئے کچھ کوالیفیکیشن درکار ہوتی ہے۔ کتابِ ہدایت سے ہدایت یاب ہونے کیلئے جن صفات کی ضرورت ہے وہ متقین میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان میں سب سے پہلی صفت ہے، ایمان بالغیب۔ (۳:۲) متقی جس کی صداقت اور امانت کا اعتراف کر لیتے ہیں، اسکی اگلی بات کو بلا دلیل مانتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق اور امین مان لینے کے بعد آپ کی ہر بات کے جواب میں یہی عرض کیا: امنّا وصدقنا۔ (ایمان لائے اور تصدیق کی)۔ مثلاً حضور نے فرمایا: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ متقین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کا طریقہ سیکھا اور جب انھیں اطمینانِ قلب عطا ہو گیا تو ان کا ایمان بالغیب ایمان بالشّہادت میں تبدیل ہو گیا۔ حضور نے فرمایا: نماز برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ ماننے والوں نے مان لیا اور جب انکی زندگی میں یہ مقام آ گیا، ان کا ایمان بالغیب، ایمان بالشّہادت میں تبدیل ہو گیا۔ فرمایا: ایمان بالغیب پہلا درجہ ہے۔ یہ قول ہے، یہ ماننے کا مقام ہے۔ علم، عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔ ایمان بالشّہادت علم کا مقام ہے۔ میں نے عرض کیا: تو پھر مشاہدہ کیا ہوتا ہے! فرمایا: صاحبِ مشاہدہ کیلئے مستقبل کو حال بنا دیا جاتا ہے۔ مشاہدہ عطا ہو جائے تو اس سے ایمان میں رفعت آتی ہے۔ لیکن مشاہدہ کبھی مقصود نہیں ہونا چاہئے۔ عرض کیا: تصوف کیا ہوتا ہے! فرمایا: 'تصوف' غیر قرآنی لفظ ہے۔ ہم تو یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک کے کسی بھی مقام سے 'تصوف' یا 'صوفی' کا لفظ اخذ نہیں ہوتا۔ عرض کیا: ہم تو آپ کو صوفی سمجھ کر حاضر ہوئے ہیں۔ کیا مشہور بزرگ حضرت فضل شاہ، جن کی مسندِ خلافت پر فائز ہونے کا آپ کو شرف ہے، جنکا ذکر اشفاق احمد نے اپنے اکثر تحریروں یا ڈراموں میں 'نور والے بابا جی'، 'امّی بابا جی' کہہ کر کیا ہے، کبھی 'نور والوں کے ڈیرے' کا ذکر کیا ہے، کیا وہ صوفی بزرگ نہیں تھے! فرمایا: بات سند (اتھارٹی) کے ساتھ کی جائے تو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ سند کا درجہ قرآنِ پاک کو حاصل ہے۔ بات قرآنِ پاک کے حوالے سے کی جائے تو مستند ہوتی ہے۔ عرض کیا: سند کے حوالے سے تصوف کو کیا کہا جائے گا! فرمایا: قرآنِ پاک میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاہد فرمایا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ 'شاہد' کا مطلب ہے تصدیق کرنے والا، شہادت دینے والا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے محبین میں سے جس جس کو تزکیہ و تصدیق کے شرف سے نوازا، وہ مشہود سے شاہد کے مرتبے پر سرفراز ہو گئے۔ ان تصدیق یافتہ شاہدین نے اپنے محبین میں سے جس جس کو تزکیہ عطا فرمایا اور اسکی پاکیزگی کی تصدیق کی وہ بھی شاہدین میں

شامل ہو گئے۔یہ سلسۂ شاہدین ہے جسے عرفِ عام میں صوفی کہا جاتا ہے۔عرض کیا: شاہدین کی خدمت میں حاضری کا منشا کیا ہونا چاہیئے !فرمایا: ایک صاحب کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جارہے تھے، یہی سوال انھوں نے ہم سے پوچھا۔ہم نے بتایا: عرض کرنا، جناب کیا آپ خواہش سے، خوف وحزن سے پاک ہیں!اگر جواب ہاں میں ہوتو عرض کرنا: جناب! کیا آپ خواہش سے، خوف وحزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتے ہیں! اگر جواب ہاں میں ہوتو عرض کرنا: جناب مجھے بھی خواہش سے، خوف وحزن سے پاک کر دیجئے۔واپس آکر انھوں نے بتایا کہ اس بزرگ نے فرمایا کہ ہمیں اسکا دعویٰ نہیں۔ہاں جہاں سے یہ سوال آیا ہے، وہاں اسکا جواب ضرور موجود ہے۔عرض کیا: جناب آپ خواہش، اور خوف وحزن سے پاک ہیں۔فرمایا: ہمارے شاہد نے یہ شرف ہمیں عطا فرمایا ہے۔عرض کیا: جناب خواہش، اور خوف وحزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتے ہیں !فرمایا: جسے پاک کیا جاتا ہے اسے پاک کرنے کا علم بھی عطا فرمایا جاتا ہے۔عرض کیا: میں بھی اسی مقصد کیلئے حاضر ہوا ہوں، مجھے بھی خواہش سے، خوف وحزن سے پاک فرما دیجئے۔فرمایا: 'ذکر' ہم آپ کو بتاتے ہیں، آپ اس پر عمل کریں، آپ کو پتہ چل جائے گا۔عرض کیا: کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات لکھے ہوئے ہیں کہ فلاں شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا، بزرگ نے ان پر نظر کی، اور وہ بالکل بدل گیا۔مہربانی فرما کر آپ بھی کوئی ایسی نظر فرما دیجئے۔فرمایا: کبھی کبھی کوئی شخص کسی بزرگ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوتا ہے کہ زمین تیار ہو چکی ہوتی ہے، بس خیر کا بیج بونا باقی ہوتا ہے، وہ بو دیا جاتا ہے، کام ہو جاتا ہے۔اسے 'نظر کرنا' کہتے ہیں۔اگر اس حال میں نظر کر دی جائے کہ زمین ابھی تیار نہ ہو، تو وہ بندہ ابنارمل ہو جاتا ہے۔(آپ نے پنجابی میں فرمایا: شخصیت نوں چبّ پے جاندے نیں۔) وہ بندہ اپنے حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ایسا کرنے میں کوئی عقلمندی نہیں۔نظر کرنے والے سے پوچھ ہوگی۔یہ بھی فرمایا: جو علم سینہ بسینہ عطا ہوتا ہے، وہ آگے اسی طرح عطا کیا جاتا ہے۔آپ استاد ہیں۔آپ کو علم اس طرح عطا فرمایا جانا چاہئے جسے آگے پھیلایا جانا ممکن ہو، اور آسان ہو۔فرمایا: آپ کو جو 'ذکر' بتایا گیا ہے اس پر عمل کریں، مقصد پورا نہ ہوتو ہم ذمّہ دار۔ایک مدّت سے جن سوالوں کے جواب کی تلاش تھی، احساس ہوا کہ ان میں سے کچھ سوالوں کا جواب آج پہلی بار ملا ہے اور اس طرح ملا ہے کہ کہیں دل اور دماغ کے اندر اترتا چلا گیا ہے۔دل میں یہ عہد کیا کہ ایک سال تک انکی بات پر عمل کر کے ضرور دیکھنا ہے، اگر گیارہ ماہ میں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو بھی بارہ ماہ پورے کر کے ہی بات کریں گے۔اس احساس کے ساتھ اجازت لیکر رخصت ہوئے۔چند ہی ماہ میں یقین ہو گیا کہ جس اطمینانِ قلب کی تلاش تھی، وہ عطا ہو رہا ہے، بے چینی رخصت ہو رہی ہے، سوالوں کے ایسے جواب عنایت فرمائے جا رہے ہیں

جو سند کے ساتھ ہوتے ہیں اور پھر شک کا مقام نہیں رہتا۔ میں نے یہ حال اس لئے بیان کیا ہے کہ پتہ چلے سند کے ساتھ بات کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ من مانی اصطلاحات بنا لینے اور قیاس آرائی سے کبھی حق کا علم عطا نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگ 'احسان' کو ماننے کے درجے سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ حسنِ عمل کے معنی میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرفِ عام میں جسے صوفی کہا جاتا ہے وہ حسنِ عمل کے مقام پر ہوتا ہے۔۴۰ شاہدین یقیناً حسنِ عمل کا نمونہ ہوتے ہیں اور اپنے پیروؤں کو اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ لیکن حسنِ قول کے بغیر تو حسنِ عمل کا مقام آ ہی نہیں سکتا اور بندے کے ذمّے تو یہی ہے کہ وہ اپنے قول کو سدید بنائے، اعمال کو صالح بنانے کا وعدہ تو اللہ کا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قولِ سدید میں بات کرو۔ ہم تمھارے اعمال کی اصلاح کر دیں گے اور تمھارے گناہ معاف کر دیں گے۔۔۔ (۳۳:۷۰۔۷۱) بات قول کی پاکیزگی سے شروع ہوتی ہے۔ قول (عقیدہ، اصول، نظریہ، تصور، اصطلاح) حق کے مطابق ہو تو سدید ہوتا ہے۔ حضرت فضل شاہ اور جناب محمد اشرف فاضلی صاحب نے اس کی طریقت یوں بیان فرمائی ہے کہ جسے تزکیہ مطلوب ہو اسے شاہدین میں سے جس کی خدمت میں حاضری کا شرف ہو وہاں میل جول رکھنا چاہیے۔ محض میل جول سے اس کا قول پاک ہونا شروع ہو جائے گا۔ جیسے جیسے قول کے پاک ہونے کا احساس بڑھتا ہے، شاہد کے ساتھ محبت محسوس ہونے لگتی ہے اور بندہ اپنے اعمال میں اس کا اتباع کرنے لگتا ہے۔ شاہد کے اعمال صالح ہوتے ہیں، وہ حسن عمل کے مقام پر ہوتا ہے، اس لئے پیروی کرنے والے کے اعمال صالح ہوتے جاتے ہیں۔ صالح اعمال ہی احسن ہوتے ہیں۔ عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب کا فرمان ہے: علم، عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔ (Knowledge is post-experience.) جو قول، عمل، علم، تینوں مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہتا ہے اسے معرفت سے بطورِ انعام نواز دیا جاتا ہے۔ تصوف کو محض حسن عمل کا درجہ قرار دینے والے قول کو سدید بنانے کے اپنے حق کو بھول جاتے ہیں۔ قول، عمل، اور علم کے مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہنا انہیں یاد نہیں رہتا۔ معرفت کے مقام کی ان کے نظامِ فکر میں کہیں جگہ ہی نہیں بنتی۔ جس کا کوئی شاہد ہی نہ ہو وہ حسنِ عمل اور اسکی تصدیق کے مقام پر فائز ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ حدیثِ جبریل کی بنیاد پر اس امر کی تشریح کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ ''احسان یہ ہے کہ تو اس طرح عمل کرے جیسے تو خدا کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ درجہ میّسر نہ آئے تو۔۔۔'' کیا قرآنِ پاک سے کہیں احسان کی یہ تعریف اخذ ہوتی ہے! ارشادِ ربّانی ہے: اے ایمان والو! وہ کیوں کہتے ہو جو تم کرتے

نہیں ۔اللہ کے نزدیک بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں ۔'(۶۱:۲۔۳) کیا اس روایت کو بیان کرنے والے کا یہ دعویٰ ہے کہ اسے عمل کا یہ درجہ میّسر ہے !اگر ہے تو اس دعوے کا ثبوت کیا ہے!

یہ نظریہ، ایمان کو 'ماننے' کے درجوں میں دوسرے نمبر پر رکھتا ہے۔قرآنِ پاک مومن کے درجِ ذیل نو مقامات بیان کرتا ہے: توبہ، عبادت، حمد، صوم، رکوع، سجدہ، امر بالمعروف، نہی عنِ المنکر، حفاظت لی حدود اللہ ۔(القرآن، ۹:۱۱۲) اگر 'احسان'، ایمان سے بڑا کوئی درجہ ہے تو اس نظریہ کے ماننے والوں کو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بتانا چاہئے کہ وہ کون سے اضافی مقامات ہیں جو مومن کے مقامات میں شامل نہیں مگر محسنین کے مقامات میں شامل ہیں۔

سلسلۂ شاہدین میں ہر شاہد ایک ادارہ ہوتا ہے۔ایک صاحب کو مرشد مانا جاتا ہے، دیگر لوگ معتقد ہوتے ہیں ۔مرشد مزّ کی ہوتا ہے، خوف وحزن سے پاک ہوتا ہے، اور خوف وحزن سے پاک کرنے کا محکم علم رکھتا ہے۔ تزکیہ کے طالب اس سے میل جول رکھتے ہیں، اسکی اطاعت اور اتباع کو اپنا حال بناتے ہیں ۔جسے کامل تزکیہ عطا ہوتا ہے اور اسکی تصدیق کردی جاتی ہے، اسے شاہدین میں سے ہونے کا شرف عطا ہو جاتا ہے۔کسی کو وضو کرا دیا جاتا ہے، دائمی پاک دامنی اس کا حال ہو جاتی ہے، اور وہ مخلصین کی صف میں شمار ہو جاتا ہے۔مخلصین وہ لوگ ہوتے ہیں جن پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں ۔مرشد کو اللہ کا دوست ہونے کا شرف ہوتا ہے ۔اللہ اپنے دوستوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالتا ہے۔جو ان کی خدمت میں ادب اور محبت سے حاضر ہوتا ہے، اسے کچھ بھی نہ آتا ہو، اس کا رخ ظلمات سے نور کی طرف ہو جاتا ہے ۔وہ نور والوں میں سے ہو جاتا ہے۔پیر ومرشد جناب حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب نے فرمایا: ایک آدمی حضرت فضل شاہ قطبِ عالمؒ کے ڈیرہ پاک 'ادارۂ قادریہ نور والوں کا ڈیرہ' پر حاضر ہوا۔پیر صاحب نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: 'او نور والے!' حضور پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے وہ واش روم گیا اور بہت جلد باہر آ گیا۔اپنے ساتھیوں کو علم عطا فرمانے کیلئے حضور قبلہ محمد اشرف فاضلی صاحب نے عرض کیا: حضور! لگتا نہیں کہ اسے ٹھیک طرح طہارت کرنا بھی آتا ہو، اور حضور فرما رہے ہیں 'او نور والے!'۔حضرت فضل شاہؒ نے فرمایا: بیٹا! ہم اللہ کے دوست ہیں ناں۔' عرض کیا: 'جی! حضور اللہ کے دوست ہیں ۔'فرمایا: 'ہم نور والے ہیں ناں ۔'عرض کیا: 'جی! حضور نور والے ہیں ۔'فرمایا: 'یہ نور والوں کے پاس آیا ہے۔اس کا رخ نور والوں کی طرف ہے۔یہ نور والا ہے۔' فرمایا: 'بیٹا! اگر اس کو طہارت کرنا نہیں آتا تو آ جائے گا۔' کیا 'احسان' کو 'حسنِ عمل' کے مترادف قرار دیکر اس ادارے کے ماخذ اور نوعیت کی تشریح کی جاسکتی ہے! ہرگز نہیں۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بندہ اپنا تزکیہ آپ کرسکتا ہے۔۴۱ اگر ایسا ممکن ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسے رسول کے بھیجے جانے کیلئے دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی جو لوگوں کو تزکیہ عطا کرے۔اسی طرح بعثتِ رسول کا مقصد بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ لوگوں کو پاک کرتے ہیں۔(القرآن، ۱۲۹:۲، ۱۵۱:۲)۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، روزہ، و دیگر فرض اور نوافل عبادات اور ذکر اذکار کا طریقہ سکھا دیا ہے، اور اسی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تزکیہ عطا فرماتے تھے، یہ تمام چیزیں قرآنِ پاک اور احادیث میں محفوظ ہیں۔ جو بندہ اپنا تزکیہ کرنا چاہے وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایسا کرسکتا ہے۔تفسیرِ فاضلی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ قرآنِ پاک میں کہیں بھی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنا تزکیہ خود کریں، یا وہ ایسا کرسکتے ہیں۔اللہ کی طرف رجوع لانے والے کسی شخص کا حال پر اتباع کئے بغیر اگر کوئی شخص بزعمِ خود تزکیہ یافتہ ہونے کا دعویٰ دار بن بیٹھے تو اس کے دعویٰ کی تصدیق کون کرے گا۔اگر ایسا شخص از خود اپنے آپ کو شاہد کے مقام پر فائز کرلے تو اسکی تصدیق کی حیثیت کیا ہو گی! کتاب اگر 'معلم' کا فریضہ سرانجام دے سکتی تو پھر انبیاء کرام کے مبعوث کئے جانے کی ضرورت کیا ہو سکتی تھی۔جو 'کتاب' کو 'صاحبِ کتاب' کی جگہ دیتا ہے وہ اپنے علاوہ کسی کو نہیں مانتا۔یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ہے کہ اللہ نے انہیں معلمِ کتاب وحکمت بنا کے بھیجا ہے۔(۱۵۱:۲ ; ۱۶۴:۳) ارشادِ ربّانی ہے: ''جیسا کہ ہم نے تم میں، تمھیں میں سے ایک رسول بھیجا، کہ تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتا ہے، اور تمھیں پاک کرتا ہے، اور تمھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ تعلیم دیتا ہے جس کا تمھیں علم نہ تھا۔''(۱۵۱:۲) اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر کے ضمن میں حضرت فضل شاہ اور جناب حضرت محمد اشرف فاضلی کا ارشاد ہے: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت دعا کی تھی کہ ان کی ذریّت سے ایک رسول مبعوث فرمایا جائے جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرے، انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے۔ بے شک اللہ عزت والا حکمت والا ہے۔ دعا کو شرفِ قبولیت بخشا گیا، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آپ کی دعا کا حاصل ہوئے۔جن کی اصلاح مقصود ہو، معیار ان کے سامنے ہمہ وقتی موجود رہنا چاہیے۔حکم اللہ تعالیٰ کا ہو، نمونہ اسکا محبوب ہو۔کتاب کی تعلیم یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی بجا آوری واضح ہو۔حکمت کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا علم عطا ہو۔یہ علم پہلے نہیں تھا کسی کو، کہ خلافِ حق کرنے والے کی لاعلمی پر شہادت دینے سے اس کا بچاؤ ہو جاتا ہے۔اس سے معافی کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور دیر چاہے لگ جائے، رحمت کی شاخ اس سے پھوٹتی ضرور ہے۔حکم اللہ کا ہو، نمونہ اسکا محبوب ہو۔جسے اللہ کا

محبوب پاک کرے اسکی بسم اللہ عمل سے ہوتی ہے۔کتاب وحکمت کی تعلیم سے صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔''
ارشادِ ربّانی ہے:''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا جب انھیں میں سے رسول مبعوث فرمایا۔ان پر اسکی آیات تلاوت فرماتا ہے،اور انہیں تزکیہ عطا کرتا ہے،اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔اور اس سے قبل وہ یقیناً گمراہی میں تھے۔''(۱۶۴:۳) اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر کے ضمن میں ارشاد ہے:''مومنین پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ امّی تھے اور ان میں مبعوث ہونے والا رسول بھی امّی ہے۔اس میں تمام مشکلات کا حل رکھا گیا ہے، جو بھی مومنین کو پیش آسکتی تھیں یا آسکتی ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض جس قدر آسانی کے ساتھ محبین کو حاصل ہوا اس سے بڑا کوئی معیار ہو نہیں سکتا۔آپ نے لوگوں پر اللہ کی آیات تلاوت فرمائیں۔انہیں تزکیے کی نعمت سے نوازا کہ پاک ہو تو فلاح ہوتی ہے۔انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی۔فرمان کا علم اور فرمان سے استفادہ کرنے کی طریقت روشن فرمائی۔اس سے قبل جو کچھ بھی کیا جاتا تھا انسانی تجویز سے تعلق رکھتا تھا۔انسانی تجویز گمراہی ہی پیدا کرتی ہے۔حضور کا امّی ہونا مومنین پر بڑا احسان ہے۔حکم کی تلاوت، تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم شاہدین جاری رکھتے ہیں۔انسانی تجویز سے گمراہی ہی پیدا ہوتی ہے۔''(۲۵۳۔۵۴ ص،تفسیرِ فاضلی منزل اول) جو شاہد کی تکذیب کرتا ہے یا اسکا عمل اس کے دعویٰ ء اطاعت کی تصدیق نہیں کرتا،وہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔'' آیت شریفہ''اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ،رحم فرمانے والا ہے۔''(۱۲۹:۲) کی تفسیر کے ضمن میں محترم مصنفین تفسیر فاضلی کا ارشاد ہے:مالک تو سب کا اللہ تعالیٰ ہے۔جو اللہ تعالیٰ کے محبوب کو مان کر اس کے محبوب کے قدم بہ قدم ہو جائے،اسے اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے چاہے ہوئے کو چاہتا ہے۔جو اس کے خلاف راہ لے،وہ عذاب میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔جو اپنی حیثیت کو جان کر حق کی طرف لوٹ آئے،اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے،اور اس پر رحم فرماتا ہے۔''(ص ۲۳۶)

قبر کو بھی معلّم/شاہد ہونے کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔اگر قبر کو شاہد ہونے کا درجہ حاصل ہوتا تو پھر حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزارِ اقدس سے زیادہ کون اس کا حقدار ہو سکتا تھا!تزکیہ اور تصدیق عطا فرمانے کا حق صرف صاحبِ حال کو ہوتا ہے۔حضرت فضل شاہ اور حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب نے اس بات کو کیا خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے:'حال،حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔'('د' ص، منزل اول،تفسیرِ فاضلی) قبر کو شاہد ماننا صاحبِ حال کی تحقیر ہے۔شاہد سے میل جول رکھا جائے تو قول پاک ہو جاتا ہے۔قول پاک ہو جائے تو شاہد سے محبت ہو جاتی ہے۔جس سے محبت ہو جائے بندہ خود بخود اسکا اتباع

کرنے لگ جاتا ہے۔شاہد کے اتباع سے اعمال کی اصلاح ہونے لگتی ہے۔علم، عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔جو قول، عمل اور علم تینوں مقامات پر شاہد کے اتباع میں پورا رہتا ہے، اسے مخلصین میں سے ہونے کا شرف ہو جاتا ہے۔'مخلص' کی شان یہ ہے کہ اس پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں۔(۱۵:۴۰ ; ۳۸:۸۳) کیا صاحبِ حال کی معیّت اختیار کئے بغیر یہ ممکن ہے! ہرگز نہیں۔ایک پنجابی شاعر بابا ستھرا نے اس بات کو کیا خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

مویاں دیاں منّن ڈھیریاں تے جیوندیاں نال رکھن ویر

ایہنیں کمیں ستھریا کدی نہیں ہُندی خیر

اوپر میں نے ذکر کیا کہ کبھی کبھی کوئی شخص کسی بزرگ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوتا ہے کہ زمین تیار ہو چکی ہوتی ہے، بس خیر کا بیج بونا باقی ہوتا ہے، وہ بو دیا جاتا ہے، کام ہو جاتا ہے۔اسے نظر کرنا کہتے ہیں۔ قرآنِ پاک کی ایک تمثیل کی روشنی میں اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ منور ہے ، وہ اللہ کے نور سے ہے۔کسی مقام پر اگر نورِ معرفت کو اللہ کے سوا میں دیکھا جائے گا تو شرک ہو جائے گا اور شرک ظلمِ عظیم ہے۔''نورِ الٰہی کی مثال اس طرح بیان فرمائی گئی ہے،''کہ ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے۔طاق وہ محفوظ مقام ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہے۔پھر چراغ ایک شیشے میں رکھا ہوا ہے جو بالکل صاف ہے۔اس میں کوئی سیاہی نہیں کہ روشنی کے پھیلنے میں حائل ہو۔یہ شیشہ روشنی کو پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔یہ مومن کا قلب ہے۔چراغ میں جو تیل جلتا ہے وہ زیتون کا مبارک تیل ہے جو شفّاف ہوتا ہے۔سورج کی شعاؤں میں پہلے پہر اور پچھلے پہر کا جو فرق ہوتا ہے، وہ اس مقام پر نہیں ہوتا جو مقام باغ کے درمیان میں ہو۔جو تیل ایسے شجرِ مبارک سے حاصل ہو، وہ انتہائی شفّاف ہوتا ہے اور روشنی کو قبول کرنے کی اعلیٰ استعداد رکھتا ہے۔یہ تیل جب جلتا ہے تو نور''علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اللہ اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے تو یہ راہ ملتی ہے اور اسے ہی ملتی ہے جس کو اللہ دکھائے۔اللہ لوگوں کیلئے مثالیں بیان فرما کر اس نورِ ہدایت کی طلب کو واضح کرتا ہے، اور اللہ کو ہر شئے کا علم ہے۔ حاصل: حصولِ علم کی طلب رکھنے والے کو آسمانوں اور زمین میں ہر مقام پر نور سے واسطہ پڑتا ہے۔اللہ کا نور، نورِ حقیقی ہے باقی سب نور اسکی بدولت ہیں۔نورِ ہدایت کو محفوظ مقام پر ہونا چاہیے، شیشے کی طرح صاف اور روشن دل میں ہونا چاہیے۔حق کو ماننے کی وہ طلب ہونی چاہیے، کہ حق سامنے آتے ہی نورٌ علیٰ نور کی کیفیت حاصل ہو۔ نور کی راہ دکھانا اللہ کی شان ہے اور اللہ کا کام ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔مثالیں بیان فرما کر لوگوں پر ایک احسان کیا جاتا

ہے۔اللہ کا علم ہی علمِ مطلق ہے۔"۴۲ مومن کا قلب وہ شیشہ ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہے۔ یہ شیشہ اتنا صاف ہے کہ یہ ستارے کی مانند چمکتا ہے۔اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شیشہ چراغ کی روشنی کو کس قدر،اور کس خوبصورتی سے پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔قلب،عقل کا مقام ہے۔(ارشادِ ربّانی ہے: کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی!تو ان کے قلوب ہوں تو عقل کریں،یا کان ہوں تو سنیں۔تو آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ولیکن قلب اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔(۴۶:۲۲) عقل کا کام بندے کو تضاد سے پاک ہونے میں مدد دینا ہے۔عقل کو زیتون کے اس تیل سے تشبیہ دی گئی ہے جو روشنی کو قبول کرنے کی اعلیٰ استعداد رکھتا ہے۔عقل جب کنفیوژن سے پاک ہو، خالص ہو،تو اس میں اللہ کے نورِ ہدایت سے روشن ہوا ٹھنے کی اعلیٰ استعداد ہوتی ہے۔ آسمان اور زمین اللہ کے نورِ ہدایت سے منور ہیں، اللہ کی نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔لیکن جب انسان خواہشات کی پیروی میں لگ جاتا ہے،عقل خالص نہیں رہتی،قلب کا شیشہ دھندلا جاتا ہے،سیاہ پڑ جاتا ہے۔(جو خواہشات کی پیروی کرتے ہیں،گمراہ ہو جاتے ہیں۔۲۸:۱۸, ۴۳:۲۵, ۴۵:۲۳،... ,) جس کی عقل خالص ہو،جس کا شیشہ شفاف ہو،اللہ اس قلب کو اپنے نورِ معرفت کی راہ دکھاتا ہے۔شاھد وہ منور چراغ ہے جس سے نورِ معرفت عطا ہوتا ہے۔(۴۶:۳۳) مؤمن کا قلب جب منور ہوتا ہے تو نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اللہ علیمِ مطلق ہے۔وہ جسے اپنے فضل سے نوازنا پسند فرماتا ہے،علمِ مطلق سے فرماتا ہے۔اللہ بندوں کی رہنمائی کیلئے مثالیں بیان فرماتا ہے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اویسیہ ایک سلسلۂ شاہدین ہے جہاں تزکیہ یا تصدیق کیلئے شاہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ عطائے تزکیہ کے عمل کو ایک اسرار بنا دیتے ہیں۔۴۳ تفسیرِ فاضلی کے مطابق یہ بات درست نہیں۔'اویسیہ' سلسلۂ شاہدین نہیں بلکہ علم عطا کرنے کا ایک خصوصی طریقِ کار ہے۔سیدنا حضرت اویس قرنیؓ شاہد نہیں تھے،رئیس العاشقین تھے۔بہت بڑی شان کے مالک تھے۔شاہدین کی شان ہے کہ وہ جسمانی طور پر فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی اپنے کسی محبّ کو فیضیاب فرما سکتے ہیں۔علم عطا کرنے کے عام طریقِ کار کے علاوہ بھی طریقِ کار ہیں،قرآنِ پاک میں ان کا ذکر ہے۔مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر آپ کی والدہ محترمہ کو علم عطا فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے بچانے کیلئے کیا کرنا چاہئے۔پھر حضرت موسیٰ کو دریا میں ڈالنے کے بعد جب اس کا دل بے قابو ہونے کے قریب تھا،تو اللہ تعالیٰ نے اس کے قلب پر ربط رکھا،اسے آسرا دیا۔ (۲۸:۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت بی بی مریم علیہا السلام کو علم عطا فرمایا کہ اپنا پاؤں زمین پر ماریں وہاں سے چشمہ پھوٹ نکلے گا اور کھجور کے

تنے کو ہلائیں، تازہ کھجوریں گریں گی۔ بچے کے حوالے سے لوگوں کے استفسار کے جواب میں کیا کہنا ہے، اس کے بارے میں بھی علم عطا فرمایا۔ (۱۹:۲۳۔۲۹) قرآنِ پاک میں اللہ کے ایک بندے کا ذکر ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات دو دریاؤں کے سنگم پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انہیں اپنے پاس سے ایک خاص علم (علمِ لدنی) سے نوازا ہے۔ (۱۸:۶۶) لیکن وہ شاہد نہیں تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی شاہد کے مقام پر تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جنّات بھی تھے اور پرندے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جنّات کو آپ کے تابع کیا ہوا تھا، اور آپ پرندوں کی بولیوں کا علم بھی رکھتے تھے۔ آپ نے چیونٹوں کے سردار کی بات سن بھی لی اور سمجھ بھی لی۔ جب ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کیلئے آ رہی تھی، تو آپ نے اپنے درباریوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون ملکہ سبا کا تخت یہاں لا سکتا ہے۔ جن نے عرض کیا کہ وہ دربار برخاست ہونے سے پہلے یہ کام کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے پہلے لانا درکار ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے عرض کیا جناب آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے تخت یہاں موجود ہوگا، اور وہ وہاں موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اسے کتاب کا ایک علم عطا فرمایا تھا۔ (۲۷:۳۸۔۴۰)

'وحدت الوجود' اور 'وحدت الشہود' کا کچھ تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ نظریہ کہ اللہ تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور باقی ہر شے اسکا اظہار، مسلم فکر کی تاریخ میں 'وحدت الوجود' یا Doctrine of the unity/oneness of all being or unity/oneness of all existence کہلاتا ہے۔ اس نظریہ کے دو بنیادی مفروضات میں سے ایک یعنی یہ کہ 'الحق' اللہ تعالیٰ کا نام ہے پہلے زیرِ بحث آ چکا ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ پاک کے مطابق 'الحق' قرآنِ پاک کا نام ہے اور اللہ 'الحق' کا نازل فرمانے والا ہے۔ اللہ کو 'الحق' کہنا درست نہیں۔ دوسرے بنیادی مفروضے کہ 'اللہ تعالیٰ 'وجودِ مطلق' ہے اور باقی سب کچھ اس کے اختیار کیے ہوئے عارضی تعینات (یعنی وجودِ اضافی) کا ذکر اب کیا جائے گا۔ 'وجود' عربی زبان کا لفظ ہے اور 'و۔ج۔د' مادے سے اسکا تعلق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں وجودِ مطلق ہوتا تو عربی زبان میں نازل فرمائے گئے قرآنِ پاک میں اس بات کو بیان کر دینے میں کیا مشکل تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کے بیان میں 'وجودِ مطلق' یا اس مادے کا کوئی دیگر لفظ مثلاً 'موجود' یا 'غیر موجود' وغیرہ استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔ کیا کوئی دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کو اللہ سے زیادہ جان سکتا ہے! ولیم سی چٹک کہتا ہے:

"Ibn Arabi is not a philosopher, but a sage, a visionary and *wahdat al-wuju*d is one of the many

dimentions of his overall vision of reality which Ibn Arabi wants to convey to his reader. He further observes: "One of Ibn Arabi's themes is that reason or intellect *('aql)* is inadiquate as a source of knowledge of God, the self, and the world."**44**

ابن عربی کی اپنی تعلیمات بنیادی طور پر 'کشف'، 'شہود' 'مشاہدہ' 'ذوق' پر مشتمل ہیں جو عقل کی حدود سے ماوراء ہیں۔[۴۵] چنگ کے درجِ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ ابنِ عربی کے نزدیک اسکا اپنا وژن ہی معیار حق ہے۔اسکے مکتبِ فکر کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔قرآنِ پاک شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثل ہے۔اللہ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں اپنے وژن، مشاہدے یا کشف وشہود کو اتنی اہمیت دے دینا کہ اسے حق کا درجہ دے دیا جائے جبکہ اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہ کی ہو بالکل غلط بات ہے۔(۲۱:۷) شیخ احمد سرہندی نے اس نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ 'وحدت الوجود' منازلِ سلوک پر محض ایک منزل ہے اور مزید کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے اس منزل سے آگے جانے کا شرف عطا کیا تو تب انکشاف ہوا کہ یہ آخری منزل نہیں اور یہ کہ وحدت الوجود کی منزل پر خدا کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا وہ صحیح نہیں تھا۔شیخ احمد سرہندی نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور کائنات اسکی تخلیق۔اور تخلیق قطعاً اپنے خالق کی الوہیت میں کسی بھی طرح شریک نہیں، نہ اسکے اظہار کی صورت میں اور نہ اسکی تجلّی کی حیثیت سے۔'تخلیق' حقیقت ہے، لیکن 'خالق' اس سے مطلق طور پر ماوراء ہے۔شیخ احمد سرہندی کے نظریہ کو 'وحدت الشہود (transcendental unity of all manifestation)' کا نام دیا جاتا ہے۔حضرت محمد اشرف فاضلی صاحب نے فرمایا کہ ایک مقام ہے جس پر سالک کو ایسا تجربہ ہوتا ہے جسے وحدت الوجود پر محمول کر لیا جاتا ہے۔وحدت الوجود بطور تصورِ الہ خلافِ قرآن نظریہ ہے۔انھوں نے فرمایا کہ کئی بزرگ مثلاً امام العارفین حضرت سلطان باہو رحمت اللہ علیہ قطعاً وحدت الوجودی نہیں تھے ان کے اخلاف انھیں وحدت الوجودی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔وحدت الوجودی عام طور پر سمندر اور لہر، روشنائی اور حروف و الفاظ، جیسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جن کا کوئی جواز قرآن پاک سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ pantheism اور وحدت الوجود، اور panantheism اور وحدت الشہود ایک چیز ہیں۔یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔وحدت الوجود، اور وحدت الشہود مذہبی مکاتب فکر ہیں جبکہ

pantheism اور panantheism فلسفیانہ مکاتبِ فکر ہیں۔ pantheism خدا اور کائنات کو ایک دوسرے کا عین قرار دیتا ہے۔ panantheism کے مطابق خدا کی ذات کے دو پہلو ہیں: سریانی (immanent) اور ماورائی (transcendent)۔ سریانی پہلو سے کائنات وجودِ مطلق کا اظہار ہے اور وجودِ مطلق کائنات میں سریانی ہے۔ کائنات خدا کے ساتھ عینیت رکھتی ہے لیکن خدا کائنات کے عین نہیں کیونکہ خدا، کائنات سے ماوراء بھی ہے۔ خدا کے ساتھ عین ہونے کے اعتبار سے کائنات بحیثیت مجموعی اور اس کا ہر ہر رکن خدا کے جز حیثیت اختیار کر جاتا ہے جبکہ سورہ الزخرف کی آیات نمبر ۹ سے ۱۴ تک میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق، زمین کے گہوارہ بنائے جانے، اس میں راستے ٹھہرائے جانے، حیوانات میں نر اور مادہ کے تقرر، سواری کیلئے کشتیوں اور چوپایوں کے اہتمام کے حوالے سے خدا کی شان بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: ''اس کیلئے اس کے بندوں سے ایک جز ٹھہرایا ہے۔ بے شک انسان صریحاً ناشکرا ہے۔'' (۴۳:۱۵) اس آیت کی تفسیر میں تفسیر فاضلی کا ارشاد ہے: ''اللہ خالق کل ہے۔ مخلوق اسکا جز ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلئے وحدت الوجود کا عقیدہ قطعاً خلاف حق ہے۔'' (تفسیر فاضلی جلد ششم، ص ۲۵۱)۔ ابنِ عربی کا نظریۂ وحدت الوجود مذہبی نظریہ ہونے کے باوجود panantheism کے بہت قریب ہے۔ اگر ابن عربی نے اپنا نظریۂ وحدت الوجود اپنے صوفیانہ وژن اور کشف و شہود کی بنیاد پر پیش کیا تو شیخ احمد سرہندی نے بھی اپنا نظریہ وحدت الشہود کسی سند کی بنیاد پر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے بھی اپنے روحانی تجربات ہی کو بنیاد بنایا۔ تفسیرِ فاضلی کے مطابق سند کے ساتھ بات کی جائے تو 'وحدتِ شاہدین' (oneness of shahideen) صحیح نظریہ ہے۔ تمام شاہدین وجودِ واحد ہیں، کیوں کہ انکا مقصود واحد ہے، اور ان کا مقصود ہے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالنا، ان کو پاک کرنا، انکی تصدیق کرنا، ان کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمانا۔ آیت نمبر ۲۶:۴ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت فضل شاہ اور حضرت محمد اشرف فاضلی کا ارشاد ہے: ماضی، حال کا مصدق ہوتا ہے اور حال، ماضی کا مصدق۔ یہ بھی فرمایا کہ جس حال کا ماضی شاہد نہ ہو وہ حال سچا نہیں ہوتا، اور جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو وہ ماضی سچا نہیں ہوتا۔ وحدت الوجودی مکتبۂ فکر کا تصورِ خدا اپنے کشف و شہود کو معیار ٹھہرانے کی وجہ سے درست نہیں کہا جا سکتا، لیکن ان کے عشقِ رسول، تقویٰ اور پاکبازی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر اللہ تعالیٰ درگزر فرما دے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اہل روحانیت پر عام طور پر بدعت کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی نئی بات متعارف کرانے کو بدعت کہتے ہیں۔ اسلام خواہشات کی پیروی کو گمراہی قرار دیتا ہے اور خواہشات کی تشفی کو اللہ کی مقرر کردہ حدود

کے اندر رکھنے کوفرمان الٰہی کی پیروی قرار دیتا ہے۔خواہشات کی تشفی کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے دائرے میں رکھتے ہوئے انسانی زندگی میں آسانیاں مہیا کرنا،تقویٰ اور پرہیزگاری کا فروغ، افراد معاشرہ کی تخلیقی صلاحیتوں کے جلا کیلئے موزوں ماحول مہیا کرنا ،اسلامی تعلیمات سے وجود میں آنے والے تمام علوم اور قانون سازی کی بنیاد ہے۔اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تمام سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی و دیگر ادارے اور ایکٹیویٹی اسی اصول پر وجود میں آئیں گے۔ انسانی فکر اور تجربے سے وجود میں آنے والے علوم (philosophy and manmade sciences) اور اداروں کا مطمح ءنظر، ہمیشہ فرد کی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنا اور اس مقصد کو یقینی بنانے کیلئے قانون سازی کرنا ہے۔(دیگر افراد کے یکساں حقوق کو یقیناً ملحوظ رکھا جاتا ہے۔)اسلام علمی تحقیق کے دائرے میں بھی اللہ کی مقررہ حدود کی پیروی کو ضروری قرار دیتا ہے۔جبکہ مغربی تہذیب میں علمی تحقیق اس قسم کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ بظاہر ہر دو نظام ہائے فکر میں کوئی قابل عمل تعلق وجود میں لانا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔پھر فرمان الٰہی ہے: باطل کو حق میں نا ملاؤ۔(۲:۴۲) تو کیا مسلمانوں کو انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو رد کر دینا چاہیے! کیا اسلامی علوم، اور فلسفہ اور سائنس کے حاصلات، کو الگ الگ دائروں میں مقید کرنا ممکن ہے! (بدعت کو غیر مشروط طور پر رد کرنے والے لوگ اپنی کوتاہ فہمی سے یہی سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی اپنی زندگیوں میں اس کی نفی موجود ہوتی ہے۔) انسانی فکر و تجربہ کے حاصلات کو استعمال میں لانے میں قرآن پاک نے اپنے ماننے والوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا۔تفسیر فاضلی کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بدعت (principle of innovation) وہ قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔جسطرح بعض علماء کے ایک فیصلے سے صدیوں یہ غلط خیال مسلمانوں کے اندر راسخ رہا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا، اسی طرح ماضی کے بعض جیّد علماء کی کوتاہ نظری سے لوگوں کی سوچ اس حد تک مسموم ہو چکی ہے کہ بدعت کے ساتھ صرف اور صرف منفی معنی اسطرح وابستہ ہو چکے ہیں کہ اس نے مسلمانوں میں تخلیق کی صلاحیت کو کچل کے رکھ دیا ہے۔جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی تجربہ کرنے کو بدعت قرار دیکر اسکی مذمت کرتے ہیں اور پھر معاشیات، خوراک، سیاست، انتظامی معاملات، تعلیمی نظام اور نصاب، سپورٹس، حرب، بینکنگ ،میڈیکل، انجنئرنگ، انفارمیشن ٹیکنالوجی، سوشل سائنسز ،فنون لطیفہ، تعمیرات غرض زندگی کے ہر میدان میں فلسفہ و سائنس سے حاصل والے علوم کی خوشہ چینی کرتے ہیں۔اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کوئی نئی بات بدعت حسنہ بھی ہو سکتی ہے اور بدعت سیئہ بھی۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ منکرات کے معاملے میں کوئی بدعت جائز نہیں۔ایسی بدعت، بدعت سیئہ ہے۔بدعت حسنہ،

اللہ کی رضا چاہنے کیلئے ہوتی ہے۔کسی بدعت حسنہ کی حدود کا تعین کرنا اجتہاد کہلاتا ہے اور یہ راسخون فی العلم کا کام ہے۔آیئے دیکھتے ہیں قرآن پاک میں یہ اصول کہاں سے اخذ ہوتا ہے۔سورہ الحدید میں ارشاد ہے کہ'' ۔۔۔رھبانیت کی ابتداء انھوں نے (عیسائیوں نے) خود کی تھی۔یہ ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی، منشا اللہ کی رضا چاہنا تھا۔پھر اس کی رعایت نہ رکھی، جیسے اس کی رعایت کا حق تھا۔تو ان میں سے ایمان والوں کو ہم نے ان کا اجر دیا۔۔۔'' (۲۷:۵۷) تفسیر فاضلی میں اسکی تفسیر اس طرح فرمائی گئی ہے:''رھبانیت، اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف کرتے چلے جانا ہے، اور اس رویے کو اپنی پہچان بنانے کی کوشش ہے۔یہ ان لوگوں کی اپنی اختراع تھی، فرمان الٰہی نہیں تھا۔منشا ضرور اللہ کی رضا چاہنا تھا۔مگر اس میں نفس کو یہ رعایت دی جانی چاہئے تھی کہ جب وہ سواری کا کام دینے لگے، اور شاہد کے امر کو ادب سے ماننے لگے تو پھر اس کے ساتھ سختی روا نہ رکھی جائے۔'' (تفسیر فاضلی جلد ہفتم، ۱۹۹۸) اہل روحانیت کی بدولت ہی بدعت کا اصول محدود دائرے میں ابھی تک موجود ہے۔ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس اصول کو زندہ اور نافذ کیا جائے۔سورہ الحدید کی مذکورہ بالا آیت کریمہ کی روشنی میں، جمعہ کے خطبات میں اکثر پڑھی جانے والی حدیث ''کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔۔۔'' کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ فرمان الٰہی کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ گمراہی ہوگی۔آیئے چند مثالیں دیکھتے ہیں: سورہ الحج (۲۲) کی آیت نمبر ۲۷ میں ذکر ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا''اور لوگوں میں حج کی اذان دیجئے، کہ وہ آپ کے پاس آئیں۔پیادہ اور دبلے دبلے اونٹوں پر دور اہوں سے چلے آئیں۔(ترجمہ از تفسیر فاضلی، جلد چہارم، طبع دوم، ص ۲۳۹) کیا آج لوگ پیدل حج کرنے جاتے ہیں یا دبلے دبلے اونٹوں پر! اب تو بحری جہازوں کے ذریعے حج پر جانے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔کیا یہ بدعت نہیں! کیا یہ گمراہی ہے! ایک وقت تصویر اتارنے کو بدعت سیئہ سمجھا جاتا تھا، اب جب تک آپ کی تصویر آپ کے پاس نہ ہو آپ حج نہیں کر سکتے! چند سال پہلے تک رمی جمار کیلئے، جو حج کا ایک لازمی رکن ہے، بہت محدود وقت مقرر تھا۔صدیوں سے حجاج کرام ۱۰ ذوالحج کو اشراق سے دوپہر تک، اور ۱۱ اور ۱۲ ذوالحج کو دوپہر سے غروب آفتاب تک یہ رکن ادا کرتے تھے۔یہی سنت چلی آرہی تھی۔حجاج کرام کی تعداد میں اضافے کے ساتھ اس رکن کی ادائیگی اس محدود وقت میں ممکن نہیں رہی تھی۔چنانچہ چند سال قبل اس وقت کو اشراق سے غروب آفتاب تک بڑھا دیا گیا ہے۔اب تینوں دن اشراق سے غروب آفتاب تک رمی جمار کیا جاتا ہے۔کیا یہ بدعت نہیں! کیا یہ گمراہی ہے! اگر مسلمانوں میں بدعت کو قابل مذمت نہ بنا دیا گیا ہوتا، اگر اس بات کا شعور ہوتا کہ بدعت تغیرات زمانہ کے ساتھ بدلے ہوئے حالات میں اسلامی تعلیمات کو قابل عمل رکھنے کا ایک

قرآنی اصول ہےتو ہزاروں جانوں کے ضیاع سے بہت پہلے اس بارے میں اجتہاد کرلیا گیا ہوتا۔حج کے معین ایام میں چوپایوں کو ذبح کرنا بھی حج کے ارکان میں شامل ہے۔حجاج کرام کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ انفرادی طور پر اس کا اہتمام کرنا،اس میں سے خود کھانا اور محتاجوں کو کھلانا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔چنانچہ سالہا سال تک حجاج کے مشکلات کا شکار رہنے اور گوشت اور کھالوں کے ضیاع کے بعد اب قربانی کو اجتماعی اہتمام کی شکل دی گئی ہے۔کیا یہ بہت بہتر نہ ہوتا اگر بہت پہلے موزوں منصوبہ بندی کے طور پر یہ بدعت اختیار کر لی گئی ہوتی!قربانی کے گوشت سے خود کھانے کا اجتماعی اہتمام ہونا ابھی باقی ہے۔آج پوری دنیا میں مسلمان ایک ہی دن عید کیوں نہیں کر پاتے!ہر علاقے میں چاند خود دیکھ کر عید کرنا سنّت،اور مکہ شریف میں چاند دیکھ کر عید کرنا،یا سپیس سائنس کے ماہر مسلمانوں کے مرتب کئے گئے کیلنڈر کے مطابق تہواروں کو طے کرلینا انھیں بدعت دکھائی دیتا ہے اور بدعت کو وہ خلاف سنت سمجھتے ہیں،گمراہی سمجھتے ہیں۔صرف اس کوتاہ نظری کی وجہ سے مسلمان قمری تقویم کے مطابق اپنا کیلنڈر بنانے اور اسکی برکات سے محروم ہیں۔اس کیلنڈر کو چلانے سے مسلمانوں کو جو فوائد و برکات حاصل ہو سکتے ہیں ان کا کچھ اندازہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی کتاب 'خطبات بہاولپور' سے کیا جا سکتا ہے۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں قطعاً کبھی میدہ استعمال نہیں کیا۔اس وقت مسلمانوں میں میدے کی بنی ہوئی اشیاء کا استعمال کس قدر ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف غالباً دنیا کے وہ واحد شہر ہیں جہاں ان اشیاء کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔لیکن کبھی علماءدین کو اسے خلاف سنّت یا بدعت قرار دیتے ہوئے نہیں سنا۔قرآن پاک کے نزول کو چودہ صدیاں گزر گئی ہیں لیکن اب تک ہم اس کی تعلیمات کے مطابق سود سے پاک نظام معیشت،نظام سیاست،نظام حکومت،خون خرابے کے بغیر نئے موزوں حکمران کا انتخاب،صنعت میں آجر اور اجیر کا تعلق کچھ بھی مرتب نہیں کر سکے کیونکہ ہر نئی بات (بدعت) کو گمراہی قرار دے دئے جانے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔غیر مسلموں نے محض فکر و تجربہ سے ان تمام نظاموں کو نہایت باریک جزئیات کے ساتھ مرتب کرلیا ہے۔اللہ نے قرآن پاک کو 'الحق' بنا کر نازل کیا ہے اور ہم نے محققین کے مرتب کئے گئے روایات کے مجموعوں کو قرآن پاک پر فوقیت دے کر بدعت کو قابل مذمت اصول بنا دیا ہے۔شاہدین کی یہ شان ہے کہ وہ سنّت کی روح پر عمل کرتے ہیں،تغیرات زمانہ کے حوالے سے قرآن پاک کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے،بدعت کو رضاءالٰہی کا باعث سمجھتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں۔۴۶

ابھی حال ہی میں ایک کتاب 'اقبال: صاحبِ حال' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے،جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایک محترم استاد صاحب کی تصنیف ہے۔۴۷ انہوں نے اقبال کے اشعار کی تشریح و تعبیر کے ذریعے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کی اقبال صاحبِ حال بزرگ تھے۔انتساب کے بعد سب سے پہلی بات جو انہوں نے درج کی ہے وہ حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ کا ایک قول ہے کہ ''حال، ہمیشہ حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔'' لیکن پوری کتاب میں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ علّامہ صاحب کو حال کس صاحبِ حال سے عطا ہوا، ان کا شاہد کون تھا، کس نے ان کو تزکیہ عطا کیا اور ان کی تصدیق کی۔اقبال نے تو خود کہا ہے: ''یہ نہ سمجھ کہ میں بغیر شراب کے مست ہوں اور شاعروں کی مانند محض افسانہ گوئی کر رہا ہوں۔ میں تو جبریل امین کا ہم داستاں ہوں۔میرا کوئی رقیب، قاصد یا دربان نہیں، بلکہ میں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست فیض یاب ہوں۔'' ۴۸ اقبال تو خود تسلیم کر رہے ہیں کہ انہیں حال کسی صاحبِ حال سے عطا نہیں ہوا۔

اقبال کے بارے میں ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ایک دن اقبال قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ان کے والد نے کہا: بیٹا قرآنِ پاک کی تلاوت اس طرح کیا کرو جیسے یہ تمہارے اپنے اوپر نازل ہو رہا ہو۔ محمد سعید شیخ فلسفے کے ایک مشہور استاد اور ماہرِ اقبالیات تھے۔ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔اقبال اور فلسفۂ اقبال کے ساتھ ان کے تعلق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے تشریحی نوٹ اور حوالے لکھے اور اب ان ہی کا مرتب کیا ہوا نسخہ ہر سطح پر مستند نسخہ سمجھا جاتا ہے۔یہ بہت محنت طلب کام تھا جو شیخ صاحب کے ہاتھوں سرانجام ہوا۔اسلامک فلوسافیکل کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس میں جو فلیٹیز ہوٹل میں ہوا، اقبال اور ان کے والد کی بزرگی ثابت کرنے کیلئے یہی واقعہ شیخ صاحب نے بیان کیا۔شیخ صاحب کی عمر اس وقت تقریباً پچھتّر سال سے اوپر دکھائی دیتی تھی۔ چائے کے موقعہ پر میں نے شیخ صاحب سے عرض کیا: جناب تمام عمر نہایت سنجیدگی سے قرآنِ پاک کے قاری رہے ہیں اور اس عمر میں بھی آپ زیادہ وقت قرآنِ پاک ہی کو پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کر رہے ہیں، کیا آپ کے قلب پر کبھی نزولِ قرآن کا مقام آیا! شیخ صاحب نے فرمایا: نہیں! مزید فرمایا: میرا خیال ہے کہ اگر عربی پر بہت اچھا عبور ہو تو یہ مقام آ تو سکتا ہے۔میں نے عرض کیا: کیا قرآنِ پاک میں قرآنِ پاک کی اس طرح تلاوت کرنے یا کر سکنے کیلئے کوئی سند موجود ہے! شیخ صاحب کے پاس اس کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔دین اور علم کے نام پر بے سند باتیں کرنے کی ایسی بہت سی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ایک مجھے یاد آ رہی ہے۔اللہ نے قرآنِ پاک میں تدبّر کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اسے سمجھنے والوں کیلئے آسان بنا دیا۔ایک مشہور عالمِ دین کو میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ امام رازی فرماتے ہیں کہ جب میں قرآنِ پاک میں تدبّر کرنے کے بارے میں سوچتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔آیئے دیکھتے ہیں قرآنِ پاک میں کیا فرمایا گیا ہے:

(۱)تو کیا قرآنِ پاک میں تدبّر نہیں کرتے ۔اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں کثیر اختلاف پاتے ۔(۸۲:۴)

(۲)تو کیا لوگ قرآنِ پاک میں تدبّر نہیں کرتے یا ان کے قلوب پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

(۳)یہ کتاب مبارک ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے کہ لوگ اس کی آیات میں تدبّر کریں اور عقل والے نصیحت مانیں ۔(۲۹:۳۸)

(۴) کیا انہوں نے فرمان میں تدبّر نہیں کیا یا ان کے پاس وہ آیا جو ان کے پہلے آباءواجداد کے پاس نہ آیا۔(۶۸:۲۳)

کیا ان آیات سے قرآنِ پاک پر تدبّر کرنے کے بارے میں وہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد کرنا چاہ رہے ہیں۔علماء کا کام تو لوگوں کو قرآنِ پاک میں تدبّر کی ترغیب دینا اور تلقین کرنا ہونا چاہئے۔جو لوگ اس طرح کی بات کرتے ہیں وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔کھلے دل سے قرآنِ پاک کو پڑھنا اور سننا اور شہد کی حیاتِ طیبہ کو دیکھنا تدبّرِ قرآن ہے۔جو لوگ قرآنِ پاک سے رہنمائی نہیں لیتے،ان کے قلوب پر قفل لگے ہوتے ہیں،ان کی پسند انہیں حق کی طرف آنے سے روک دیتی ہے۔قرآنِ پاک مبارک کتاب ہے۔حصولِ برکت کا راستہ یہ ہے کہ حکم اللہ کا ہو نمونہ اس کا محبوب ہو۔تدبّر کرنے والے احکامِ الٰہی کی قدر کرتے ہیں۔نصیحت کا قدردان ہی نصیحت کو مانتا ہے اور وہی عقل مند ہوتا ہے۔انتہائی واجب الاحترام قول فرمانِ خداوندی ہے۔اس میں تدبّر کرنا چاہئے۔ماضی سے سبق سیکھنا چاہئے۔

حضرت علامہ اقبال کو 'صاحبِ حال' ثابت کرنے کیلئے اس کتاب میں واصف علی واصف صاحب کے اقوال کا حوالہ بھی کثرت سے دیا گیا ہے۔میں نے پروفیسر صاحب محترم سے استفسار کیا کہ واصف علی واصف صاحب کو حال کہاں سے عطا ہوا!فرمایا:حضرت فضل شاہ رحمت اللہ علیہ سے حاصل ہوا۔عرض کیا:اسکا ثبوت۔ انھوں نے فرمایا:اسی طرح سننے میں آیا ہے۔عرض کیا: کیا حضرت واصف علی واصف صاحب نے اپنے کلام میں کہیں اپنے شاہد کا ذکر کیا۔فرمایا:نہیں۔عرض کیا:آپ نے تو خود اپنی کتاب کے شروع میں حضرت فضل شاہ صاحب کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ "حال،حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحب حال سے عطا ہوتا ہے"۔اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے:"حال اپنا ہو،نام اپنے شاہد کا لیا جائے۔"جس نے کہیں اپنے شاہد کا ذکر ہی نہ کیا ہو کیا وہ حضرت فضل شاہ صاحب کا ماننے والا ہو سکتا ہے!

مصنف کو حضرت علامہ اقبال کے صاحب حال مانے جانے پر کوئی اعتراض ہے نہ حضرت واصف علی واصف صاحب کے صاحب حال مانے جانے پر۔مطلب صرف یہ ہے کہ کتاب کے آغاز میں صاحبِ حال کی جو تعریف درج کی گئی ہے،اس پر حضرت علامہ اقبال پورا اترتے ہیں اور نہ حضرت واصف علی واصف۔اسلئے

صاحب حال کی کوئی ایسی تعریف تلاش کی جانی ضروری ہے جسے ان کے بارے میں سند کے ساتھ ثابت بھی کیا جاسکے۔اچھی کتاب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تناقض سے پاک ہو۔

تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جسے عرفِ عام میں تصوف کہا جاتا ہے قرآنِ پاک کے مطابق اسے 'طریقت شاہدین' کے نام سے موسوم کیا جانا چاہئے۔مرشد کا درجہ شاہد کا ہوتا ہے۔شاہد، محبین کیلئے آیات تلاوت فرماتا ہے، انھیں کتاب وحکمت کا علم عطا کرتا ہے، اوران کو تزکیہ اور تصدیق سے نوازتا ہے۔شاہد اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں شاہد ہوتا ہے۔تمام شاہدین وجودِ واحد ہیں، کیوں کہ ان کا مقصود واحد ہے، اور انکا مقصود ہے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانا۔وحدت الوجود اور وحدت الشہود مابعد الطبیعاتی نظریات ہیں۔قرآنِ پاک کی روشنی میں وحدتِ شاہدین درست نظریہ ہے۔کشف وکرامات کسی کی بزرگی کا ثبوت نہیں ہوتے۔لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانے میں مدد دینے کیلئے اللہ اپنے پاک بندوں کو اپنے علمِ مطلق کی روشنی میں جس علم سے نوازنا پسند فرماتا ہے، خود اس سے نوازتا ہے۔شاہدین اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گذارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔وفات کے بعد ان کے مزارات سے بھی خیر وبرکات کی تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔لیکن صاحبِ حال کا درجہ صرف شاہد کو حاصل ہوتا ہے۔حال، حال پر عطا ہوتا ہے اور صاحبِ حال سے عطا ہوتا ہے۔تفسیر فاضلی ہو، کشف المحجوب ہو، مثنوی معنوی ہو یا قرآن پاک ہو، کتاب، شاہد نہیں ہوتی۔معلمِ کتاب وحکمت ہی شاہد ہوتا ہے اور اسکے تصدیق یافتہ شاہدین جو حال پر موجود ہوں۔یہی سنّت رسول اور علمِ حدیث کے وارث ہیں۔تمام ماننے والے کبھی بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ماننے کے دعویدار ہر زمانے میں تین قسم کے ہوتے ہیں: السابقون الاوّلون، اصحاب الیمین، اصحاب الشمال۔سب سے بڑا مرتبہ ان کا ہوتا ہے جو چنے ہوئے ہوتے ہیں۔یہی معیار ہوتے ہیں۔یہ السابقون الاوّلون میں سے ہی ہوسکتے ہیں۔شریعت قول ہے، طریقت عمل ہے، حقیقت علم ہے، اور معرفت انعام ہے۔شاہدین میں سے جس کی خدمت میں حاضری کا شرف ہو اس سے میل جول رکھا جائے تو قول پاک ہو جاتا ہے۔اس سے محبت ہو جائے تو اعمال احسن ہو جاتے ہیں۔عمل کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔ان تینوں مقامات پر اپنے شاہد کے اتباع میں پورا رہنے والے کو معرفت بطورِ انعام عطا فرما دی جاتی ہے۔دنیا میں پاک لوگوں کی معیت، اور آخرت میں پاک لوگوں کے ساتھ اٹھایا جانا نصیب ہو جائے، تو اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں۔قول کی حفاظت، اعمال کی حفاظت، علم کی حفاظت، اخلاص کی حفاظت اور شیطان اور شرارت سے بچائے جانے کیلئے دعا کرتے رہنا چاہئے۔

حوالہ جات

۴۰۔ولیم سی چٹک،ومرانا چٹک،ایضاً۔ڈاکٹر اسرار'احسان' کوحسنِ ایمان کے معنی میں لیتے ہیں،جبکہ چٹک اس حسنِ عمل کے معنی میں لیتا ہے۔

۴۱۔مولانا امین احسن اصلاحی،تزکیۂ نفس،فیصل آباد: ملک سنز،۱۹۸۹،۱۱۳۔۹۵

۴۲۔تفسیر فاضلی،منزل پنجم،۱۹۹۶،ص۳۲۰

۴۳۔قدرت اللہ شہاب،شہاب نامہ،لاہور،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۸۷،ص۱۱۱۴۔قدرت اللہ شہاب،جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں ایک سینئر بیوروکریٹ تھے۔وہ ادیب بھی تھے اور صوفی بھی۔۱۹۸۷ میں فوت ہوئے۔شہاب نامہ انکی خود نوشت سوانح حیات ہے جوانکی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

44. Dr. Burhan Ahmed Faruqi, The Mujjaddid's Concept of Tawhid, (Lahore: Institute of Islamic Culture, first published 1940 reprint 1989). p.9

۴۵۔ایضاً،۳۶۔۳۵

۴۶۔تفسیر فاضلی،جلد ہفتم، 1998،ص 153 ۔اس موضوع پر مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں؛ Abdul Hafeez Fazli, State and Statecraft: Relationship Between Islamic and Western Paradigms, Al-Hikmat, Vol. 28 (2008), Research Journal of the Department of Philosophy, University of the Punjab, Lahore, pp. 71-80۔

فقہ میں مالکی مکتبِ فکر کے بانی حضرت امام مالک ابن انس (وفات ۷۹۵) بدعت کوخلاف سنّت ہونے کی بناء پر باعث گمراہی سمجھتے تھے۔جبکہ شافعی مکتبِ فکر کے بانی حضرت امام محمد ابن ادریس الشافعی (وفات ۸۲۰) سنّت پاک کوقانون سازی میں اتھارٹی سمجھنے کے باوجود،بدعت حسنہ اور بدعت سیۂ میں فرق کرتے تھے اور بدعت حسنہ کوجائز اور ضروری سمجھتے تھے۔

Aslam Farouk-Alli, "Translater's Introduction" *in* Shaikh Muhammad al-Ghazali, *Within the Boundaries of Islam (A Study of Bid'ah)*, Kuala Lumpur: Islamic Book Trust, 2010, p. xxxiii.

۴۷۔ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی،فیصل آباد: ترتیب پبلشرز،آمد سوئم ۲۰۱۱

۴۸۔زبورِ عجم کے چند اشعار کا ترجمہ(بحوالہ کلیات فارسی،۵۳۸)پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوھدری،فکرِ اقبال کا ماخذ۔۔۔قرآنِ کریم،اقبال میموریل لیکچر ۲۰۱۳،شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور،ص۹